اکائی12 مہالکشمی کا پُل (متن کی تدریس)

ساخت

12.1 اغراض ومقاصد

12.2 تمہید

12.3 کرشن چندر کا تعارف اور فن

12.4 افسانہ 'مہالکشمی کا پُل' کا تجزیاتی مطالعہ

12.4.1 افسانہ 'مہالکشمی کا پُل' متن

12.4.2 افسانہ 'مہالکشمی کا پُل' تجزیہ

12.5 آپ نے کیا سیکھا

12.6 اپنا امتحان خود لیجیے

12.7 سوالات کے جوابات

12.8 فرہنگ

12.9 کتب برائے مطالعہ

12.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے

- طلبا کو کرشن چندر کی شخصیت اور فن سے متعارف کرانا
- افسانہ 'مہالکشمی کا پُل' کی فنی خصوصیات سے واقف کرانا
- افسانہ 'مہالکشمی کا پُل' کے موضوع سے متعارف کرانا
- افسانہ 'مہالکشمی کا پُل' کی قدر و قیمت کو سمجھنا

12.2 تمہید

1936 میں کارل مارکس کے اشتراکی نظریات سے متاثر ہو کر ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ کارل مارکس کے مطابق دنیا میں دو بڑے طبقے ہیں، پہلا استحصال کرنے والوں کا اور دوسرا استحصال کا شکار ہونے والوں

کا۔انسان کی بنیادی ضرورتوں روٹی، کپڑا اور مکان اور پیداوار کے ذرائع پر قبضہ کرنے والے ان لوگوں کی غریبی اور بے بسی کا فائدہ اٹھاتے ہیں جو ان سے محروم ہیں۔کرشن چندر نے اپنے افسانہ 'مہالکشمی کا پُل' میں اسی استحصال اور سماجی فرق کو پیش کیا ہے۔اس افسانے میں ممبئی کی چال میں رہنے والی چند عورتوں کے کرداروں کے حوالے سے ان کی زندگی میں پیش آنے والی معاشی اور سماجی ناانصافیوں کو پیش کیا گیا ہے۔مہالکشمی کا پل ممبئی کا ایک ریلوے اسٹیشن ہے جس کے اوپر مسافروں کے آنے جانے کے لیے ایک پل بنا ہوا ہے۔اسٹیشن کے قریب مہالکشمی کا مندر ہے جس کے نام پر اس علاقے کا نام مہالکشمی پڑ گیا۔یہاں ایک چال میں زیادہ تر کپڑا ملوں میں کام کرنے والے مزدور رہتے ہیں جن کی عورتیں آس پاس کی عمارتوں میں رہنے والے اونچے طبقے والوں کے گھروں میں برتن کپڑے اور صفائی کا کام کرتی ہیں۔ان میں سے کسی کا شوہر معذور یا بیکار بیٹھا ہے یا کوئی بیوہ ہے۔تنہا عورت گھر کی پوری ذمہ داریاں اٹھا رہی ہے۔ان کے پاس ایک سے زیادہ ساڑھی نہیں ہے جسے پہن کر وہ باہر جائیں۔اسی لیے وہ اپنی پرانی، سستی اور خستہ ساڑھی کو بار بار دھو کر مہالکشمی کے پل پر سکھاتی اور پہنتی ہیں۔ان ساڑھیوں کو علامت کے طور پر استعمال کرتے ہوئے کرشن چندر نے ممبئی کی چالوں میں رہنے والوں کی قابل رحم حالت اور ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کی تصویر کشی کی ہے۔یہ افسانہ اسی چال میں رہنے والے ایک غریب کلرک کی کی زبانی بیان کیا گیا ہے۔

12.3 کرشن چندر کا تعارف اور فن

کرشن چندر کی پیدائش 23 نومبر 1914 کو بھرت پور راجستھان میں ہوئی۔یہاں ان کے والد گوری شنکر میڈیکل افسر تھے۔ان کے والد نے بعد میں ریاست جموں وکشمیر کے پونچھ علاقے میں نوکری کر لی تھی۔جہاں کرشن چندر کا بچپن گزرا اور ابتدائی تعلیم بھی اسی جگہ حاصل کی۔اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ لاہور چلے گئے۔کرسچن کالج لاہور سے انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد ایل ایل بی کی تعلیم بھی حاصل کی لیکن وکالت نہیں کی۔1940 میں لاہور سے دہلی آئے یہاں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے اور کچھ عرصے تک پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کیا۔پھر سرکاری ملازمت ترک کر کے بمبئی چلے گئے اور ایک قلم کار کی طور پر فلموں کے لیے کہانیاں، مکالمے لکھنے لگے۔دوسرے پروڈیوسروں کے لیے لکھنے کے ساتھ ساتھ خود بھی فلمیں بنائیں لیکن دونوں میدانوں میں انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔اس کے بعد کرشن چندر نے رسالوں کے لیے افسانے اور مزاحیہ مضامین اور پبلشروں کے لیے ناول لکھنے کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا۔ایک وقت تھا جب کرشن چندر ایک ادیب کے طور پر کو اپنی زندگی میں ہی بہت مشہور اور مقبول ہو چکے تھے۔جس کے نتیجے میں انہیں افسانوں اور ناولوں کے لیے پیشگی رقم ملتی تھی اور رسالوں میں ان کے ناول قسط وار چھپتے تھے۔مختلف اداروں نے انھیں انعامات اور اعزازات سے نوازا۔1969 میں حکومتِ ہند نے انھیں پدم بھوشن کا اعزاز عطا کیا۔کرشن چندر کی تخلیقات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ زود نویس تھے۔ان کا پہلا افسانہ ''یرقان'' 1938 میں ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوا۔محض ایک

برس بعد ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''طلسمِ خیال'' 1939 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد ان کی زندگی میں ان کے افسانوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے جن میں نظارے، زندگی کے موڑ پر، نغمے کی موت، پُرانے خدا، ہم وحشی ہیں، اَن داتا، تین غنڈے، اجنتا سے آگے، یوکلپٹس کی ڈالی، ہائیڈروجن بم کے بعد، ایک خوشبو اُڑی اُڑی سی، سپنوں کا قیدی، دیوتا اور کسان، کانچ کے ٹکڑے، کشمیر کی کہانیاں، ٹوٹے ہوئے تارے، نئے غلام، کالا سورج، دل کسی کا دوست نہیں، ایک گرجا اور ایک خندق، ہوائی قلعے، سمندر دُور ہے، گھونگھٹ میں گوری چلے، میں انتظار کروں گا وغیرہ کافی مشہور ہوئے۔

اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں جن افسانہ نگاروں کو بے پناہ مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی ہے کرشن چندر اُن میں سے ایک ہیں۔ کرشن چندر کی افسانہ نگاری پر ابتدائی دور میں رومانی تحریک کا اثر تھا اور ان کے افسانوں میں مناظر فطرت اور حسن و جمال کے عناصر کا ذکر ملتا تھا۔ حالانکہ یہ اثرات بعد کے افسانوں میں بھی موجود ہیں البتہ ان میں زندگی کی بوقلمونی اور حقیقت زیادہ واضح ہوگئی ہیں۔ کرشن چندر کے افسانہ نگاری کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ رومان سے حقیقت کی طرف آئے اسی لیے ان کے افسانوں میں حقیقت اور رومان کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ اگر وہ رومان سے حقیقت کی طرف نہیں آتے تو ان کی فنکارانہ اڑان محدود ہو کے رہ جاتی اور وہ روایت کی دھند میں کھو جاتے۔

کرشن چندر کو طالب علمی کے دور سے ہی پڑھنے لکھنے میں بہت دلچسپی تھی۔ 1936 میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد اور کارل مارکس کے نظریات سے متاثر ہو کر انہوں نے مجبوروں اور غریبوں کی زندگی کو اپنے افسانوں اور ناولوں کا موضوع بنایا اور سرمایہ داری کے ظلم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کیا۔ عام طور پر ان کے افسانوں کی نثر پر تکلف اور شگفتہ ہوتی ہے مگر انہوں نے طنز کے نشتر بھی خوب چلائے ہیں۔ مغرب کے افسانوں سے متاثر ہو کر انہوں نے نئے تجربے بھی کیے۔ کرشن چندر کی ذہانت، اثر قبول کرنے کا مزاج اور چلتی ہوئی رنگین زبان انہیں اور ان کے فن کو عظیم بناتی ہے۔

12.4 افسانہ 'مہالکشمی کا پُل' کا تجزیاتی مطالعہ

12.4.1 افسانہ 'مہالکشمی کا پُل' متن

مہالکشمی کے اسٹیشن کے اس پار مہالکشمی جی کا ایک مندر ہے۔ اسے لوگ ریس کورس بھی کہتے ہیں اس مندر میں پوجا کرنے والے ہارتے زیادہ ہیں۔ جیتتے بہت کم ہیں۔ مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار ایک بہت بڑی بدرو ہے جو انسانی جسموں کی غلاظت کو اپنے متعفن پانیوں میں گھولتی ہوئی شہر سے باہر چلی جاتی ہے۔ مندر میں انسان کے دل کی غلاظت دھلتی ہے اور اس بدرو میں انسان کے جسم کی غلاظت اور ان دونوں کے بیچ میں مہالکشمی کا پل ہے۔

مہالکشمی کے پل کے اوپر بائیں طرف لوہے کے جنگلے پر چھ ساڑھیاں لہرا رہی ہیں۔ پل کے اس طرف ہمیشہ اس مقام پر چند ساڑھیاں لہراتی رہتی ہیں۔ یہ ساڑھیاں کوئی بہت قیمتی نہیں ہیں۔ ان کے پہننے والے بھی کوئی بہت زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔ یہ لوگ ہر روز ان ساڑھیوں کو دھو کر سوکھنے کے لیے ڈال دیتے ہیں اور ریلوے لائن کے اس پار جاتے ہوئے لوگ، مہالکشمی اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے لوگ، گاڑی کی کھڑکی اور دروازوں سے جھانک کر باہر دیکھنے والے لوگ اکثر ان ساڑھیوں کو ہوا میں جھولتا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ ان کے مختلف رنگ دیکھتے ہیں۔ بھورا، گہرا بھورا، مٹ میلا نیلا، قرمزی بھورا، گندا سرخ کنارہ گہرا نیلا اور لال۔ وہ اکثر انہیں رنگوں کو فضا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے۔ دوسرے لمحے میں گاڑی پل کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔

ان ساڑھیوں کے رنگ اب جاذب نظر نہیں رہے۔ کسی زمانہ میں ممکن ہے جب یہ نئی خریدی گئی ہوں، ان کے رنگ خوبصورت اور چمکتے ہوئے ہوں۔ مگر اب نہیں ہیں۔ متواتر دھوئے جانے سے ان کے رنگوں کی آب و تاب مر چکی ہے اور اب یہ ساڑھیاں اپنے پھیکے سیٹھے روز مرہ کے انداز کو لیے بڑی بے دلی سے جنگلے پر پڑی نظر آتی ہیں۔ آپ دن میں انہیں سو بار دیکھیں۔ یہ آپ کو کبھی خوبصورت دکھائی نہ دیں گی۔ نہ ان کا رنگ روپ اچھا ہے نہ ان کا کپڑا۔ یہ بڑی سستی، گھٹیا قسم کی ساڑھیاں ہیں۔ ہر روز دھلنے سے ان کا کپڑا بھی تار تار ہو رہا ہے۔ ان میں کہیں کہیں روزن بھی نظر آتے ہیں۔ کہیں ادھڑے ٹانکے ہیں کہیں بدنما چتلے داغ جو اس قدر پائدار ہیں کہ دھوئے جانے سے بھی نہیں دھلتے بلکہ اور گہرے ہوتے جاتے ہیں۔

میں ان ساڑھیوں کی زندگی کو جانتا ہوں کیونکہ میں ان لوگوں کو جانتا ہوں جو ان ساڑھیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ مہالکشمی کے پل کے قریب ہی بائیں طرف آٹھ نمبر کی چال میں رہتے ہیں۔ یہ چال متوالی نہیں ہے، بڑی غریب سی چال ہے۔ میں بھی اسی چال میں رہتا ہوں، اس لیے آپ کو ان ساڑھیوں اور ان کے پہننے والوں کے متعلق سب کچھ بتا سکتا ہوں۔

ابھی وزیر اعظم کی گاڑی آنے میں بہت دیر ہے۔ آپ انتظار کرتے کرتے اکتا جائیں گے۔ اس لیے اگر آپ ان چھ ساڑھیوں کی زندگی کے بارے میں مجھ سے کچھ سن لیں تو وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔ ادھر یہ جو بھورے رنگ کی ساڑھی لٹک رہی ہے یہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے۔ اس کے قریب جو ساڑھی لٹک رہی ہے، وہ بھی آپ کو بھورے رنگ کی دکھائی دیتی ہوگی مگر وہ تو گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ آپ نہیں میں اس کا گہرا بھورا رنگ دیکھ سکتا ہوں کیونکہ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب اس کا رنگ چمکتا ہوا گہرا بھورا تھا اور اب اس دوسری ساڑھی کا رنگ بھی ویسا ہی بھورا ہے جیسا شانتا بائی کی ساڑھی کا اور شاید آپ ان دونوں ساڑھیوں میں بڑی مشکل سے کوئی فرق محسوس کر سکیں۔ میں بھی جب ان کے پہننے والوں کی زندگیوں کو دیکھتا ہوں تو بہت کم فرق محسوس کرتا ہوں مگر یہ پہلی ساڑھی جو بھورے رنگ کی ہے وہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے اور جو دوسری بھورے رنگ کی ہے اور جس کا گہرا رنگ بھورا صرف میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں وہ جیونا بائی کی ساڑھی ہے۔ شانتا بائی کی

زندگی بھی اس کی ساڑھی کے رنگ کی طرح بھوری ہے۔شانتا بائی برتن مانجھنے کا کام کرتی ہے۔اس کے تین بچے ہیں۔ایک بڑی لڑکی ہے دو چھوٹے لڑکے ہیں۔ بڑی لڑکی کی عمر چھ سال ہوگی۔سب سے چھوٹا لڑکا دو سال کا ہے۔شانتا بائی کا خاوند سیون مل کے کپڑا کھاتے میں کام کرتا ہے۔اسے بہت جلد جانا ہوتا ہے۔اس لیے شانتا بائی اپنے خاوند کے لیے دوسرے دن کی دوپہر کا کھانا رات ہی کو پکا کر رکھتی ہے۔، کیونکہ صبح اسے خود برتن صاف کرنے کے لیے اور پانی ڈھونے کے لیے دوسروں کے گھروں میں جانا ہوتا ہے۔اور اب وہ ساتھ میں اپنی چھ برس کی بچی کو بھی لے جاتی ہے۔اور دوپہر کے قریب چال میں واپس آتی ہے۔واپس آ کے وہ نہاتی ہے اور اپنی ساڑھی دھوتی ہے اور سکھانے کے لیے پل کے جنگلے پر ڈال دیتی ہے۔اور پھر ایک بے حد غلیظ اور پرانی دھوتی پہن کر کھانا پکانے میں لگ جاتی ہے۔شانتا بائی کے گھر چولہا اس وقت سلگ سکتا ہے جب دوسروں کے ہاں چولہے ٹھنڈے ہو جائیں۔یعنی دوپہر کو دو بجے اور رات کے نو بجے۔ان اوقات میں ادھر اور ادھر سے دونوں وقت گھر سے باہر برتن مانجھنے اور پانی ڈھونے کا کام کرنا ہوتا ہے۔اب تو چھوٹی لڑکی بھی اس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔شانتا بائی برتن صاف کرتی ہے۔چھوٹی لڑکی برتن دھوتی جاتی ہے۔دو تین بار ایسا ہوا کہ چھوٹی لڑکی کے ہاتھ سے چینی کے برتن گر کر ٹوٹ گئے۔اب میں جب کبھی چھوٹی لڑکی کی آنکھیں سوجی ہوئی اور اس کے گال سرخ دیکھتا ہوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ کسی بڑے گھر میں چینی کے برتن ٹوٹے ہیں اور اس وقت شانتا بھی میرے نمستے کا جواب نہیں دیتی۔جلتی بھنتی بڑبڑاتی چولہا سلگانے میں مصروف ہو جاتی ہے اور چولہے میں آگ کم اور دھواں زیادہ نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔چھوٹا لڑکا جو دو سال کا ہے دھوئیں سے اپنا دم گھٹتا دیکھ کر چیختا ہے تو شانتا بائی اس کے چینی ایسے نازک رخساروں پر زور زور سے چپتیں لگانے سے باز نہیں آتی اس پر بچہ اور زیادہ چیختا ہے۔یوں تو یہ دن بھر روتا رہتا ہے کیونکہ اسے دودھ نہیں ملتا ہے اور اسے اکثر بھوک رہتی ہے اور دو سال کی عمر ہی میں اسے باجرے کی روٹی کھانی پڑتی ہے۔اسے اپنی ماں کا دودھ دوسرے بھائی بہن کی طرح صرف پہلے چھ سات ماہ نصیب ہوا، وہ بھی بڑی مشکل سے۔پھر یہ خشک باجری اور ٹھنڈے پانی پر پلنے لگا۔ہماری چال کے سارے بچے اسی خوراک پر پلتے ہیں۔وہ دن بھر ننگے رہتے ہیں اور رات کو گدڑی اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔سوتے میں بھی وہ بھوکے رہتے ہیں اور جاگتے میں بھی بھوکے رہتے ہیں اور جب شانتا بائی کے خاوند کی طرح بڑے ہو جاتے ہیں تو پھر دن بھر باجری اور ٹھنڈا پانی پی پی کر کام کرتے جاتے ہیں اور ان کی بھوک بڑھتی جاتی ہے اور ہر وقت معدے کے اندر اور دل کے اندر اور دماغ کے اندر ایک بوجھل سی دھمک محسوس کرتے ہیں اور جب پگار ملتی ہے تو ان میں سے کئی ایک سیدھے تاڑی خانے کا رخ کرتے ہیں۔تاڑی پی کر چند گھنٹوں کے لیے یہ دھمک زائل ہو جاتی ہے لیکن آدمی ہمیشہ تو تاڑی نہیں پی سکتا۔ایک دن پیے گا، دو دن پیے گا تیسرے دن کی تاڑی کے پیسے کہاں سے لائے گا۔آخر کھولی کا کرایہ دینا ہے۔راشن کا خرچہ ہے ہے۔ بھاجی ترکاری ہے۔تیل اور نمک ہے۔بجلی اور پانی ہے۔شانتا بائی کی بھوری ساڑھی ہے جو چھٹے ساتویں ماہ تار تار ہو جاتی ہے۔کبھی سات ماہ سے زیادہ نہیں چلی۔یہ مل والے بھی پانچ روپے چار آنے میں کیسی نکمی کھدی ساڑھی دیتے ہیں۔ان کے کپڑے میں

ذرا جان نہیں ہوتی۔ چھٹے ماہ سے جو تار تار ہونا شروع ہوتا ہے تو ساتویں ماہ بڑی مشکل سے سی کے، جوڑ کے، گانٹھ کے، ٹانکے لگا کے کام دیتا ہے اور پھر وہی پانچ روپے چار آنے خرچ کرنا پڑتے ہیں اور وہی بھورے رنگ کی ساڑھی آ جاتی ہے۔ شانتا کو یہ رنگ بہت پسند ہے اس لیے کہ یہ میلا بہت دیر میں ہوتا ہے۔ اسے گھروں میں جھاڑو دینا ہوتی ہے۔ برتن صاف کرنا ہوتے ہیں، تیسری چوتھی منزل تک پانی ڈھونا ہوتا ہے۔ وہ بھورا رنگ پسند نہیں کرے گی تو کیا کھلتے ہوئے شوخ رنگ گلابی، بسنتی، نارنجی پسند کرے گی۔ وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے۔ وہ تین بچوں کی ماں ہے لیکن کبھی اس نے یہ شوخ رنگ بھی دیکھے تھے، پہنے تھے۔ انہیں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پیار کیا تھا۔ جب وہ دھاردار میں اپنے گاؤں میں تھی جہاں اس نے بادلوں میں شوخ رنگوں والی دھنک دیکھی تھی، جہاں میلوں میں اس نے شوخ رنگ ناچتے ہوئے دیکھے تھے، جہاں اس کے باپ کے دھان کے کھیت تھے، ایسے شوخ ہرے ہرے رنگ کے کھیت اور آنگن میں پیرو کا پیڑ جس کے ڈال ڈال سے وہ پیرو توڑ کر کھایا کرتی تھی۔ جانے اب پیرووں میں وہ مزہ ہی نہیں ہے، وہ شیرینی اور گھلاوٹ ہی نہیں ہے۔ وہ رنگ وہ چمک دمک کہاں جا کے مرگئی اور وہ سارے رنگ کیوں یک لخت بھورے ہو گئے۔ شانتا بائی کبھی برتن مانجتے مانجتے، کبھی کھانا پکاتے، کبھی ساڑھی دھوتے اسے پل کے جنگلے پر لا کر ڈالتے ہوئے یہ سوچا کرتی ہے اور اس کی بھوری ساڑھی سے پانی کے قطرے آنسوؤں کی طرح ریل کی پٹری پر بہتے جاتے ہیں اور دوسرے دیکھنے والے لوگ ایک بھورے رنگ کی بدصورت عورت کو پل کے اوپر جنگلے پر ایک بھوری ساڑھی کو پھیلاتے ہوئے دیکھتے ہیں اور بس دوسرے لمحے میں گاڑی پل کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔

جیونا بائی کی ساڑھی جو شانتا بائی کی ساڑھی کے ساتھ لٹک رہی ہے گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ بظاہر اس کا رنگ شانتا بائی کی ساڑھی سے بھی پھیکا نظر آئے گا۔ لیکن اگر آپ اسے غور سے دیکھیں گے تو اس پھیکے پن کے باوجود یہ آپ کو گہرے گہرے بھورے رنگ کی نظر آئے گی۔ یہ ساڑھی بھی ساڑھے پانچ روپئے چار آنے کی ہے اور بڑی ہی بوسیدہ ہے۔ دو ایک جگہ سے پھٹی ہوئی تھی لیکن اب وہاں پر ٹانکے لگ گئے ہیں اور اتنی دور سے معلوم بھی نہیں ہوتے۔ ہاں آپ وہ بڑا ٹکڑا ضرور دیکھ سکتے ہیں جو گہرے نیلے رنگ کا ہے اور اس ساڑھی کے بیچ میں جہاں سے یہ ساڑھی بہت پھٹ چکی تھی، لگایا گیا ہے۔ یہ ٹکڑا جیونا بائی کی اس سے پہلے ساڑھی کا ہے اور دوسری ساڑھی کو مضبوط بنانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ جیونا بائی بیوہ ہے اس لیے وہ ہمیشہ پرانی چیزوں سے نئی چیزوں کو مضبوط بنانے کے ڈھنگ سوچا کرتی ہے۔ پرانی یادوں سے نئی یادوں کی تلخیوں کو بھول جانے کی کوشش کیا کرتی ہے۔ جیونا بائی اپنے اس خاوند کے لیے روتی رہتی ہے جس نے ایک دن اسے نشے میں مار مار کر اس کی ایک آنکھ کانی کر ڈالی تھی۔ وہ اس لیے نشے میں تھا کہ وہ اس روز مل سے نکالا گیا تھا۔ بڈھا ڈھونڈ اب مل میں کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ گو وہ بہت تجربہ کار تھا لیکن اس کے ہاتھوں میں اب اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ وہ جوان مزدوروں کا مقابلہ کر سکتا۔ بلکہ وہ تو اب دن رات کھانسی میں مبتلا رہنے لگا تھا۔ کپاس کے ننھے ننھے ریشے اس کے پھیپھڑوں

میں جا کے ایسے دھنس گئے تھے جیسے چرخیوں اور اینٹوں میں سوت کے چھوٹے چھوٹے مہین تاگے پھنس جاتے ہیں۔ جب برسات آتی تو یہ ننھے ننھے ریشے اسے دمے میں مبتلا کر دیتے۔ اور جب برسات نہ ہوتی تو وہ دن بھر اور رات بھر کھانستا۔ ایک خشک اور مسلسل کھنکھار۔۔۔۔ گھر میں اور کارخانے میں جہاں وہ کام کرتا تھا۔۔۔۔ سنائی دیتی رہتی تھی۔ مل کے مالک نے اس کھانسی کی خطرناک گھنٹی کو سنا اور ڈھونڈو کو مل سے نکال دیا۔ ڈھونڈو اس کے چھ ماہ بعد مر گیا۔ جیونا بائی کو اس کے مرنے کا بہت غم ہوا۔ کیا ہوا اگر غصے میں آ کے ایک دن اس نے جیونا بائی کی آنکھ نکال لی تھی۔ تیس سال کی شادی شدہ زندگی ایک لمحے کے غصے پر قربان نہیں کی جا سکتی اور اس کا غصہ بجا تھا۔ اگر مل مالک ڈھونڈو کو یوں ہی بے قصور نوکری سے الگ نہ کرتا تو کیا جیونا کی آنکھ نکل سکتی تھی۔ ڈھونڈو ایسا نہ تھا۔ اسے اپنی بے کاری کا غم تھا۔ اپنی پینتیس سالہ ملازمت سے برطرف ہونے کا غم تھا اور سب سے بڑا رنج اس بات کا تھا کہ مل مالک نے چلتے وقت اسے ایک دھیلا بھی تو نہیں دیا۔ پینتیس سال پہلے جیسے ڈھونڈو خالی ہاتھ مل میں کام کرنے کے لیے آیا تھا اسی طرح خالی ہاتھ واپس لوٹا اور دروازے پر باہر نکلنے پر اور اپنا نمبری کارڈ پیچھے چھوڑ آنے پر اسے ایک دھچکا سا لگا۔ باہر آ کے اسے ایسا معلوم ہوا جیسے ان پینتیس سالوں میں کسی نے اس کا سارا رنگ، سارا خون، اس کا سارا رس چوس لیا ہو اور اسے بے کار سمجھ کر باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا ہو۔ اور ڈھونڈو بڑی حیرت سے مل کے دروازے کو اور اس بڑی چمنی کو دیکھنے لگا جو بالکل اس کے سر پر ایک خوفناک دیو کی طرح آسمان سے لگی کھڑی تھی۔ یکا یک ڈھونڈو نے غم اور غصے سے اپنے ہاتھ ملے، زمین پر زور سے تھوکا اور پھر تاڑی خانے میں چلا گیا۔ لیکن جیونا کی ایک آنکھ جب بھی نہ جاتی اگر اس کے پاس علاج کے لیے پیسے ہوتے۔ وہ آنکھ تو گل گل کر سڑ سڑ کر، خیراتی ہسپتالوں میں ڈاکٹروں، کمپونڈروں اور نرسوں کی بداحتیاتی اور گالیوں اور لاپروائیوں کا شکار ہو گئی۔ اور جب جیونا اچھی ہو گئی تو ڈھونڈو بیمار پڑ گیا اور ایسا بیمار پڑا کہ پھر بستر سے نہ اٹھ سکا۔ ان دنوں میں جیونا اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ شانتا بائی نے مدد کے طور پر اسے چند گھروں میں برتن مانجنے کا کام دلوا دیا تھا اور گو وہ اب بوڑھی تھی اور مشاقی سے اور صفائی سے برتنوں کو صاف نہ رکھ سکتی تھی پھر بھی وہ آہستہ آہستہ رینگ رینگ کر اپنے کمزور ہاتھوں میں جھوٹی طاقت کے بودے سہارے پر جیسے تیسے کام کرتی رہی۔ خوبصورت لباس پہننے والی، خوشبو اور تیل لگانے والی بیویوں کی گالیاں سنتی رہی اور کام کرتی رہی۔ کیونکہ اس کا ڈھونڈو بیمار تھا اور اسے اپنے آپ کو اور اپنے خاوند کو زندہ رکھنا تھا۔۔ لیکن ڈھونڈو زندہ نہ رہا اور اب جیونا بائی اکیلی تھی۔ خیریت اس میں تھی کہ بالکل اکیلی تھی اور اب اسے صرف اپنا دھندا کرنا تھا۔ شادی کے دو سال بعد اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لیکن جب وہ جوان ہوئی تو کسی بدمعاش کے ساتھ بھاگ گئی اور اس کا آج تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر کسی نے بتایا اور پھر بعد میں بہت سے لوگوں نے بتایا کہ جیونا بائی کی بیٹی فارس روڈ پر چمکیلا، بھڑکیلا لباس پہنے بیٹھی ہے لیکن جیونا بائی کو یقین نہیں آیا۔ اس نے اپنی ساری زندگی پانچ روپے چار آنے کی دھوتی پہنے بسر کر دی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس کی لڑکی بھی ایسا کرے گی۔ وہ ایسا نہ کرے گی اس کا اسے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ وہ کبھی فارس روڈ نہیں گئی کیونکہ اسے اس کا یقین تھا کہ اس کی بیٹی وہاں نہیں

ہے۔ بھلا اس کی بیٹی وہاں کیوں جانے لگی۔ یہاں اپنی کھولی میں کیا نہیں تھا۔ پانچ روپے چار آنے والی دھوتی تھی۔ باجرے کی روٹی تھی۔ ٹھنڈا پانی تھا۔ سوکھی عزت تھی۔ اور یہ سب کچھ چھوڑ کر وہ فارس روڈ کیوں جانے لگی۔ اسے تو کوئی بدمعاش اپنی محبت کا سبز باغ دکھا کے لے گیا تھا۔ کیوں کہ عورت محبت کے لیے سب کچھ کر گزرتی ہے۔ خود وہ تیس سال پہلے اپنے ڈھونڈو کے لیے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر یہیں چلی آئی تھی۔ جس دن ڈھونڈو مرا اور لوگ اس کی لاش کو جلانے کے لیے لے جانے لگے اور جیونا نے اپنی سیندور کی ڈبیا اپنی بیٹی کی انگیا پر انڈیل دی۔ جو اس نے بڑی مدت سے ڈھونڈو کی نظروں سے چھپا کر رکھی تھی۔ عین اسی وقت ایک گدرائے جسم کی بھاری عورت بڑا چمکیلا لباس پہنے اس سے آ کے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اسے دیکھ کر جیونا کو یقین آ گیا کہ جیسے اب سب کچھ مر گیا ہے۔ اس کا پتی، اس کی بیٹی، اس کی عزت، جیسے وہ زندگی بھر روٹی نہیں غلاظت کھاتی رہی ہے۔ جیسے اس کے پاس کچھ نہیں تھا، شروع ہی سے کچھ نہیں تھا۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اس سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ اسے نہتا، ننگا اور بے عزت کر دیا گیا تھا اور جیونا کو اس ایک لمحے میں احساس ہوا کہ وہ جگہ جہاں اس کا خاوند زندگی بھر کام کرتا رہا اور وہ جگہ جہاں اس کی آنکھ اندھی ہوگئی اور وہ جگہ جہاں اس کی بیٹی اپنی دکان سجا کر بیٹھ گئی، ایک بہت بڑا کارخانہ ہے جس میں کوئی ظالم جابر ہاتھ انسانی جسموں کو لے کر گنے کا رس نکالنے والی چرخی میں ٹھونستا چلا جاتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے توڑ مروڑ کر دوسری طرف پھینکتا جاتا ہے اور یکا یک جیونا اپنی بیٹی کو دھکا دے کر الگ کھڑی ہوگئی اور چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

تیسری ساڑھی کا رنگ مٹ میلا نیلا ہے۔ یعنی نیلا بھی ہے اور میلا بھی ہے اور مٹیالا بھی ہے۔ کچھ عجیب سا رنگ ہے جو بار بار دھونے پر بھی نہیں نکھرتا بلکہ غلیظ ہو جاتا ہے۔ یہ میری بیوی کی ساڑھی ہے۔ میں فورٹ میں دھنو بھائی کی فرم میں کلرکی کرتا ہوں۔ مجھے پینسٹھ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ سیون مل اور بکسر یا مل کے مزدوروں کو یہی تنخواہ ملتی ہے اس لیے میں بھی ان کے ساتھ آٹھ نمبر کی چال کی ایک کھولی میں رہتا ہوں۔ مگر میں مزدور نہیں ہوں ایک کلرک ہوں۔ میں ٹائپ کر سکتا ہوں۔ میں انگریزی میں عرضی بھی لکھ سکتا ہوں۔ میں اپنے وزیر اعظم کی تقریر جلسے میں سن کر سمجھ بھی لیتا ہوں۔ آج ان کی گاڑی تھوڑی دیر میں مہالکشمی کے پل پر آئے گی، نہیں وہ ریس کورس نہیں جائیں گے۔ وہ سمندر کے کنارے ایک شاندار تقریر کریں گے۔ اس موقع پر لاکھوں آدمی جمع ہوں گے۔ ان لاکھوں میں میں بھی ایک ہوں گا۔ میری بیوی کو وزیر اعظم کی باتیں سننے کا بہت شوق ہے مگر میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا کیوں کہ ہمارے آٹھ بچے ہیں اور گھر میں ہر وقت پریشانی سی رہتی ہے۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی چیز کم ہو جاتی ہے۔ راشن تو روز کم پڑ جاتا ہے۔ اب نل میں پانی بھی کم آتا ہے۔ رات کو سونے کے لیے جگہ بھی کم پڑ جاتی ہے اور تنخواہ تو اس قدر کم پڑتی ہے کہ مہینے میں صرف پندرہ دن چلتی ہے۔ باقی پندرہ دن سود خور پٹھان چلاتا ہے اور وہ بھی کیسے گالیاں بکتے بکتے۔ گھسیٹ گھسیٹ کر، کسی سست رفتار گاڑی کی طرح یہ زندگی چلتی ہے۔ میرے آٹھ بچے ہیں لیکن یہ اسکول میں نہیں پڑھ سکتے۔ میرے پاس ان کی فیس کے پیسے کبھی نہ ہوں گے۔ پہلے

پہل جب میں نے بیاہ کیا تھا اور ساوتری کو اپنے گھر یعنی اس کھولی میں لایا تھا تو میں نے بہت کچھ سوچا تھا۔ ان دنوں ساوتری بھی بڑی اچھی اچھی باتیں سوچا کرتی تھی۔ گوبھی کے نازک نازک ہرے ہرے پتوں کی طرح پیاری پیاری باتیں۔ جب وہ مسکراتی تھی تو سنیما کی خوبصورت تصویر کی طرح خوبصورت دکھائی دیا کرتی تھی۔ اب وہ مسکراہٹ نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔ اس کی جگہ ایک مستقل تیوری نے لے لی ہے۔ وہ ذرا سی بات پر بچوں کو بے تحاشہ پیٹنا شروع کر دیتی ہے اور میں تو کچھ بھی کہوں، کیسے بھی کہوں، کتنی بھی لجاجت سے کہوں وہ بس کاٹے کھانے کو دوڑتی ہے۔ پتہ نہیں ساوتری کو کیا ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں دفتر میں سیٹھ کی گالیاں سنتا ہوں۔ گھر پر بیوی کی گالیاں سنتا ہوں اور ہمیشہ خاموش رہتا ہوں۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں، شاید میری بیوی کو ایک نئی ساڑھی کی ضرورت ہے، شاید اسے صرف ایک نئی ساڑھی کی ہی نہیں، ایک نئے چہرے، ایک نئے گھر، ایک نئے ماحول، ایک نئی زندگی کی ضرورت ہے مگر اب ان باتوں کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تو آزادی آ گئی ہے اور ہمارے وزیر اعظم نے یہ کہہ دیا ہے کہ اس نسل کو یعنی ہم لوگوں کو اپنی زندگی میں کوئی آرام نہیں مل سکتا۔ میں نے ساوتری کو اپنے وزیر اعظم کی تقریر جو اخبار میں چھپی تھی سنائی تو وہ اسے سن کر آگ بگولہ ہو گئی اور اس نے غصے میں آ کر چولہے کے قریب پڑا ہوا ایک چمٹا میرے سر پر دے مارا۔ زخم کا نشان جو آپ میرے ماتھے پر دیکھ رہے ہیں اسی کا نشان ہے۔ ساوتری کی مٹ میلی نیلی ساڑھی پر بھی ایسے کئی زخموں کے نشان ہیں مگر آپ انہیں دیکھ نہیں سکیں گے۔ میں دیکھ سکتا ہوں۔ ان میں سے ایک نشان تو اسی مونگیا رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی کا ہے جو اس نے اوپیرا ہاؤس کے نزدیک بھوندو رام پارچہ فروش کی دکان پر دیکھی تھی۔ ایک نشان اس کھلونے کا تھا جو پچیس روپے کا تھا اور جسے دیکھ کر میرا پہلا بچہ خوشی سے کلکاریاں مارنے لگا تھا۔ لیکن جسے ہم خرید نہ سکے اور جسے نہ پا کر میرا بچہ دن بھر روتا رہا۔ ایک نشان اس تار کا ہے جو ایک دن جبل پور سے آیا تھا جس میں ساوتری کی ماں کی شدید علالت کی خبر تھی۔ ساوتری جبل پور جانا چاہتی تھی لیکن ہزار کوشش کے بعد بھی کسی سے مجھے روپے ادھار نہ مل سکے تھے اور ساوتری جبل پور نہ جا سکی تھی۔ ایک نشان اس تار کا تھا جس میں اس کی ماں کی موت کا ذکر تھا۔ ایک نشان۔۔۔

مگر میں کس کس نشان کا ذکر کروں۔ ان چتلے چتلے، گدلے گدلے غلیظ داغوں سے ساوتری کی پانچ روپے چار آنے والی ساڑھی بھری پڑی ہے۔ روز روز دھونے پر بھی یہ داغ نہیں چھوٹتے اور شاید جب تک یہ زندگی رہے یہ داغ یوں ہی رہیں گے۔ ایک ساڑھی سے دوسری ساڑھی میں منتقل ہوتے جائیں گے۔

چوتھی ساڑھی قرمزی رنگ کی ہے اور قرمزی رنگ میں بھورا رنگ بھی جھلک رہا ہے۔ یوں تو یہ سب مختلف رنگوں والی ساڑھیاں ہیں، لیکن بھورا رنگ ان سب میں جھلکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان سب کی زندگی ایک ہے۔ جیسے ان سب کی قیمت ایک ہے۔ جیسے یہ سب زمین سے کبھی اوپر نہیں اٹھیں گی۔ جیسے انہوں نے کبھی شبنم میں ہنستی ہوئی دھنک، افق پر چمکتی ہوئی شفق، بادلوں میں لہراتی ہوئی برق نہیں دیکھی۔ جیسے شانتا بائی کی جوانی

ہے۔ وہ جیونا کا بڑھاپا ہے۔ وہ ساوتری کا ادھیڑپن ہے۔ جیسے یہ سب ساڑھیاں، زندگیاں، ایک رنگ، ایک سطح، ایک تواتر، ایک تسلسل یکسانیت لیے ہوئے ہوا میں جھولتی جاتی ہیں۔

یہ قرمزی رنگ کی بھورے رنگ کی ساڑھی جھبو بھیئے کی عورت کی ہے۔ اس عورت سے میری بیوی کبھی بات نہیں کرتی کیونکہ ایک تو اس کے کوئی بچہ وچہ نہیں ہے اور ایسی عورت جس کے کوئی بچہ نہ ہو بڑی نحس ہوتی ہے۔ جادو ٹونے کر کے دوسروں کے بچوں کو مار ڈالتی ہے اور بدروحوں کو بلا کے اپنے گھر میں بسا لیتی ہے۔ میری بیوی اسے کبھی منھ نہیں لگاتی۔ یہ عورت جھبو بھیا نے خرید کر حاصل کی ہے۔ جھبو بھیا مراد آباد کا رہنے والا ہے لیکن بچپن سے ہی اپنا دیس چھوڑ کر ادھر چلا آیا۔ وہ مراٹھی اور گجراتی زبان میں بڑے مزے سے گفتگو کر سکتا ہے۔ اسی لیے اسے بہت جلد پوارمل کے گنی کھاتے میں جگہ مل گئی۔

جھبو بھیا کو شروع سے ہی بیاہ کا شوق تھا۔ اسے بیڑی کا، تاڑی کا کسی چیز کا شوق نہیں تھا۔ شوق تھا تو صرف اس بات کا کہ اس کی شادی جلدی سے جلد ہو جائے۔ جب اس کے پاس ستر اسی روپے اکٹھے ہو گئے تو اس نے اپنے دیس جانے کی ٹھانی تا کہ وہاں اپنی برادری سے کسی کو لے آئے، مگر پھر اس نے سوچا ان ستر اسی روپوں سے کیا ہوگا، آنے جانے کا کرایہ بھی بڑی مشکل سے پورا ہوگا۔ چار سال کی محنت کے بعد اس نے یہ رقم جوڑی تھی لیکن اس رقم سے وہ مراد آباد جا سکتا تھا، جا کے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے جھبو بھیا نے ایک بدمعاش سے بات چیت کر کے اس عورت کو سو روپے میں خرید لیا۔

اسی روپے اس نے نقد دیے۔ بیس روپے ادھار میں رہے، جو اس نے ایک سال کے عرصے میں ادا کر دیے۔ بعد میں جھبو بھیا کو معلوم ہوا کہ یہ عورت بھی مراد آباد کی رہنے والی تھی۔ دھیرج گاؤں کی اور اس کی برادری کی ہی تھی۔ جھبو بڑا خوش ہوا۔ چلو یہیں بیٹھے بیٹھے سب کام ہو گیا۔ اپنی جات برادری کی، اپنے ذلعے کی۔ اپنے دھرم کی عورت یہیں بیٹھے بٹھائے سو روپے میں مل گئی۔ اس نے بڑے چاؤ سے اپنا بیاہ رچایا اور پھر اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی لڑیا بہت اچھا گاتی ہے۔ وہ خود بھی اپنی پاٹ دار آواز میں زور سے گانے بلکہ گانے سے زیادہ چلانے کا شوقین تھا۔ اب تو کھولی میں دن رات گویا کسی نے ریڈیو کھول دیا ہو۔ دن میں لڑیا کھولی میں کام کرتے ہوئے گاتی تھی۔ رات کو جھبو اور لڑیا دونوں گاتے تھے۔ ان کے یہاں کوئی بچہ نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے ایک طوطا پال رکھا تھا۔ میاں مٹھو خاوند اور بیوی کو گاتے دیکھ دیکھ کر خود بھی لہک لہک کر گانے لگے۔ لڑیا میں ایک اور بات بھی تھی۔ جھبو نہ بیڑی پیتا نہ سگریٹ نہ تاڑی نہ شراب۔ لڑیا بیڑ، سگریٹ، تاڑی سبھی کچھ پیتی تھی۔ کہتی تھی پہلے وہ یہ سب کچھ نہیں جانتی تھی مگر جب سے وہ بدمعاشوں کے پلے پڑی اسے یہ سب بری باتیں سیکھنا پڑیں اور اب وہ اور سب باتیں تو چھوڑ سکتی ہے مگر بیڑی اور تاڑی نہیں چھوڑ سکتی۔ کئی بار تاڑی پی کر لڑیا نے جھبو پر حملہ کر دیا اور جھبو نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس موقع پر طوطا بہت شور مچاتا تھا۔ رات کو دونوں کو گالیاں بکتا دیکھ کر خود بھی پنجرے میں ٹنگا ہوا زور زور سے وہی گالیاں بکتا جو وہ دونوں بکتے تھے ایک بار تو اس کی گالی سن کر جھبو غصے

میں آ کے طوطے کو پنجرے سمیت بدرو میں پھینکنے لگا تھا مگر جیونا نے بیچ میں پڑ کر طوطے کو بچا لیا تھا۔ طوطے کو مارنا پاپ ہے۔ جیونا نے کہا۔ تمہیں براہمنوں کو بلا کے پرائیچت کرنا پڑے گا۔ تمہارے پندرہ بیس روپے کھل جائیں گے۔ یہ سوچ کر جھبو نے طوطے کو بدرو میں غرق کر دینے کا خیال ترک کر دیا۔

شروع شروع میں تو جھبو کو ایسی شادی پر چاروں طرف سے گالیاں پڑیں۔ وہ خود بھی لڑیا کو بڑے شبہ کی نظروں سے دیکھتا اور کئی بار بلا وجہ اسے پیٹا اور خود بھی مل سے غیر حاضر رہ کر اس کی نگرانی کرتا رہا مگر آہستہ آہستہ لڑیا نے اپنا اعتبار ساری چال میں قائم کر لیا۔ لڑیا کہتی تھی کہ عورت سچے دل سے بدمعاشوں کے پلے پڑنا پسند نہیں کرتی، وہ تو ایک گھر چاہتی ہے چاہے چھوٹا ہی سا ہو۔ وہ ایک خاوند چاہتی ہے جو اس کا اپنا ہو۔ چاہے وہ جھبو بھیا ایسا ہر وقت شور مچانے والا، زبان دراز، شیخی خور ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ایک ننھا بچہ چاہتی ہے چاہے وہ کتنا ہی بدصورت کیوں نہ ہو اور اب لڑیا کے پاس بھی گھر تھا اور جھبو بھی تھا اور اگر بچہ نہیں تھا تو کیا ہوا ہو جائے گا اور اگر نہیں ہوتا تو بھگوان کی مرضی۔ یہ میاں مٹھو ہی اس کا بیٹا بنے گا۔

ایک روز لڑیا اپنے میاں مٹھو کا پنجڑا جھلا رہی تھی اور اسے چوری کھلا رہی تھی اور اپنے دل کے سپنوں میں ایسے ننھے بالک کو دیکھ رہی تھی جو فضا میں ہمکتا اس کی آغوش کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا کہ چال میں شور بڑھنے لگا اور اس نے دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ چند مزدور جھبو کو اٹھائے چلے آ رہے ہیں اور ان کے کپڑے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ لڑیا کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بھاگتی بھاگتی نیچے گئی اور اس نے بڑی درشتی سے اپنے خاوند کو مزدوروں سے چھین کر اپنے کندھے پر اٹھا لیا اور اپنی کھولی میں لے آئی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ جھبو سے گنی کھاتے کے مینیجر نے کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی اس پر جھبو نے بھی اسے دو ہاتھ جڑ دیے۔ اس پر بہت واویلا مچا اور مینیجر نے اپنے بدمعاشوں کو بلا کر جھبو کی خوب پٹائی کی اور اسے مل سے باہر نکال دیا۔ خیریت ہوئی کہ جھبو بچ گیا ورنہ اس کے مرنے میں کوئی کثر نہ تھی۔

لڑیا نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ اس نے اسی روز سے اپنے سر پر ٹوکری اٹھالی اور گلی گلی ترکاری بھاجی بیچنے لگی، جیسے وہ زندگی میں یہی دھندا کرتی آئی ہے۔ اس طرح محنت مزدوری کر کے اس نے اپنے جھبو کو اچھا کر لیا۔ جھبو اب بھلا چنگا ہے مگر اب اسے کسی مل میں کام نہیں ملتا۔ وہ دن بھر اپنی کھولی میں کھڑا مہالکشمی کے اسٹیشن کے چاروں طرف بلند و بالا کارخانوں کی چمنیوں کو تکتا رہتا ہے۔ سیون مل، نیو مل، اولڈ مل، پوار مل، دھنراج مل لیکن اس کے لیے کسی مل میں جگہ نہیں ہے کیونکہ مزدور کو گالیاں کھانے کا حق ہے گالی دینے کا نہیں ہے۔ آج کل لڑیا بازاروں اور گلیوں میں آوازیں دے کر بھاجی ترکاری فروخت کرتی ہے اور گھر کا سارا کام بھی کرتی ہے۔ اس نے بیڑی، تاڑی سب چھوڑ دی ہے۔ ہاں اس کی ساڑھی، قرمزی بھورے رنگ کی ساڑھی جگہ جگہ سے پھٹتی جا رہی ہے۔ تھوڑے دنوں تک اگر جھبو کو کام نہ ملا تو لڑیا کو اپنی ساڑھی پر پرانی ساڑھی کے ٹکڑے جوڑنا پڑیں گے اور اپنے میاں مٹھو کو چوری کھلانا بند کرنا پڑے گی۔

پانچویں ساڑھی کا کنارہ گہرا نیلا ہے۔ساڑھی کا رنگ گدلا سرخ ہے۔لیکن کنارہ گہرا نیلا ہے اور اس نیلے میں اب بھی کہیں کہیں چمک باقی ہے۔یہ ساڑھی دوسری ساڑھیوں سے بڑھیا ہے کیونکہ یہ ساڑھے پانچ روپے چار آنے کی نہیں ہے۔اس کا کپڑا،اس کی چمک دمک کہے دیتی ہے کہ یہ ان سے ذرا مختلف ہے۔آپ کو دور سے یہ مختلف معلوم نہیں ہوتی ہوگی مگر میں جانتا ہوں کہ یہ ان سے ذرا مختلف ہے۔اس کا کپڑا بہتر ہے۔اس کا کنارہ چمک دار ہے۔اس کی قیمت پونے نو روپے ہے۔یہ ساڑھی منجولا کی ہے۔یہ ساڑھی منجولا کے بیاہ کی ہے۔

منجولا کے بیاہ کو ابھی چھ ماہ بھی نہیں ہوئے ہیں۔اس کا خاوند گذشتہ ماہ چرخی کے گھومتے ہوئے پٹے کی لپیٹ میں آ کے مارا گیا تھا اور اب سولہ برس کی خوبصورت منجولہ بیوہ ہے۔اس کا دل جوان ہے۔اس کا جسم جوان ہے۔اس کی امنگیں جوان ہیں لیکن وہ اب کچھ نہیں کر سکتی کیونکہ اس کا خاوند مل کے ایک حادثے میں مر گیا ہے۔وہ پٹہ بڑا ڈھیلا تھا اور گھومتے ہوئے بار بار پھٹپھٹاتا تھا اور کام کرنے والوں کے احتجاج کے باوجود اسے مل مالکوں نے نہیں بدلا تھا کیونکہ کام چل رہا تھا اور دوسری صورت میں تھوڑی دیر کے لیے کام بند کرنا پڑتا ہے۔پٹے کو تبدیل کرنے کے لیے روپیہ خرچ ہوتا ہے۔مزدور تو کسی وقت بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔اس کے لیے روپیہ تھوڑی خرچ ہوتا ہے لیکن پٹہ تو بڑی قیمتی شئے ہے۔

جب منجولا کا خاوند مارا گیا تو منجولا نے ہرجانے کی درخواست دی جو نامنظور ہوئی کیونکہ منجولا کا خاوند اپنی غفلت سے مرا تھا۔اس لیے منجولا کو کوئی ہرجانہ نہ ملا اور وہ اپنی وہی نئی دلہن کی ساڑھی پہنے رہی جو اس کے خاوند نے پونے نو روپے میں اس کے لیے خریدی تھی۔کیونکہ اس کے پاس کوئی دوسری ساڑھی نہ تھی جو وہ اپنے خاوند کی موت کے سوگ میں پہن سکتی۔وہ اپنے خاوند کے مرجانے کے بعد بھی دلہن کا لباس پہننے پر مجبور تھی کیونکہ اس کے پاس کوئی دوسری ساڑھی نہ تھی اور جو ساڑھی تھی وہ یہی گدلے سرخ رنگ کی تھی۔پونے نو روپے کی ساڑھی جس کا کنارہ گہرا نیلا ہے۔

شاید اب منجولا بھی پانچ روپے چار آنے کی ساڑھی پہنے گی۔اس کا خاوند زندہ رہتا جب کبھی وہ دوسری ساڑھی پانچ روپے چار آنے کی لاتی،اس لحاظ سے اس کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔مگر فرق اتنا ضرور ہوا ہے کہ وہ یہ ساڑھی آج پہننا چاہتی ہے۔ایک سفید ساڑھی پانچ روپے چار آنے والی جسے پہن کر وہ دلہن نہیں بیوہ معلوم ہو سکے۔یہ ساڑھی اسے دن رات کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔اس ساڑھی سے جیسے اس کے مرحوم خاوند کی بانہیں لپٹی ہیں،اس کے ہر تار پر اس کے شفاف بوسے مرقوم ہیں۔جیسے اس کے تانے بانے میں اس کے خاوند کی گرم گرم سانسوں کی حدت آمیز غنودگی ہے۔اس کے سیاہ بالوں والی چھاتی کا سارا پیار دفن ہے۔جیسے اب یہ ساڑھی نہیں ہے،ایک گہری قبر ہے جس کی ہولناک پہنائیوں کو وہ ہر وقت اپنے جسم کے گرد لپیٹ لینے پر مجبور ہے۔منجولا زندہ قبر میں گاڑی جا رہی ہے۔

چھٹی ساڑھی کا رنگ لال ہے لیکن اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اس کی پہننے والی مر چکی ہے، پھر بھی یہ ساڑھی یہاں جنگلے پر بدستور موجود ہے۔ روز کی طرح دھلی دھلائی جنگلے پر جھول رہی ہے۔ یہ مائی کی ساڑھی ہے جو ہماری چال کے دروازے کے قریب اندر کھلے آنگن میں رہا کرتی تھی۔ مائی کا ایک بیٹا ہے ستیو۔ وہ اب جیل میں ہے۔ ہاں ستیو کی بیوی اور اس کا لڑکا یہیں نیچا آنگن میں دروازے کے قریب نیچے پڑے رہتے ہیں۔ ستیو اور ستیو کی بیوی، ان کی لڑکی اور بڑھیا مائی، یہ سب لوگ ہماری چال کے بھنگی ہیں۔ ان کے لیے کھولی بھی نہیں ہے اور ان کے لیے اتنا کپڑا بھی نہیں ملتا جتنا ہم لوگ کو ملتا ہے اس لیے یہ لوگ آنگن میں رہتے ہیں۔ وہیں کھانا کھاتے ہیں وہیں زمین پر پڑ کر سو رہتے ہیں۔ وہیں پہ یہ بڑھیا ماری گئی تھی۔ وہ بڑا سوراخ جو آپ اس ساڑھی میں دیکھ رہے ہیں پلو کے قریب۔ یہ گولی کا سوراخ ہے، یہ کارتوس کی گولی مائی کو بھنگیوں کے ہڑتال کے دنوں میں لگی تھی۔ نہیں وہ اس ہڑتال میں حصہ نہیں لے رہی تھی۔ وہ بے چاری تو بہت بوڑھی تھی، چل پھر بھی نہ سکتی تھی۔ اس ہڑتال میں تو اس کا بیٹا ستیو اور دوسرے بھنگی شامل تھے، یہ لوگ مہنگائی مانگتے تھے اور کھولی کا کرایہ مانگتے تھے۔ یعنی اپنی زندگی کے لیے دو وقت کی روٹی کپڑا اور سر پر ایک چھت چاہتے تھے۔ اس لیے ان لوگوں نے ہڑتال کی تھی اور جب ہڑتال خلاف قانون قرار دے دی گئی تو ان لوگوں نے جلوس نکالا اور اس جلوس میں مائی کا بیٹا ستیو آگے آگے تھا اور خوب زور شور سے نارے لاگا تا تھا۔ پھر جب جلوس بھی خلاف قانون قرار دے دیا گیا تو گولی چلی اور ہماری چال کے سامنے چلی۔

ہم لوگوں نے اپنے دروازے بند کر لیے لیکن گھبراہٹ میں چال کا دروازہ بند کرنا کسی کو یاد نہ رہا اور پھر ہمیں بند کمروں میں ایسا معلوم ہوا گویا گولی ادھر سے ادھر سے چاروں طرف سے چل رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بالکل سناٹا ہو گیا اور جب ہم لوگوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا تو جلوس تتر بتر ہو چکا تھا اور ہماری چال کے قریب بڑھیا مری پڑی تھی۔ یہ اسی بڑھیا کی لال ساڑھی ہے جس کا بیٹا ستیو اب جیل میں ہے۔

اس لال ساڑھی کو اب بڑھیا کی بہو پہنتی ہے۔ اس ساڑھی کو بڑھیا کے ساتھ جلا دینا چاہیے تھا مگر کیا کیا جائے تن ڈھکنا زیادہ ضروری ہے۔ مردوں کی عزت و احترام سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے کہ زندوں کا تن ڈھکا جائے۔ یہ ساڑھی جلنے جلانے کے لیے نہیں ہے۔ تن ڈھکنے کے لیے ہے۔ ہاں کبھی کبھی ستیو کی بیوی اس کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ لیتی ہے کیونکہ اس میں پچھلے اسی برسوں کے سارے آنسو اور ساری امنگیں اور ساری فتحیں اور شکستیں جذب ہیں۔ آنسو پونچھ کر ستیو کی بیوی پھر اسی ہمت سے کام کرنے لگتی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کہیں کوئی گولی نہیں چلی، کوئی جیل نہیں گیا۔

اے لو! باتوں باتوں میں وزیر اعظم صاحب کی گاڑی نکل گئی۔ وہ یہاں نہیں ٹھہری۔ میں سمجھتا تھا وہ یہاں ضرور ٹھہرے گی۔ وزیر اعظم صاحب درشن دینے کے لیے گاڑی سے نکل کر تھوڑی دیر کے لیے پلیٹ فارم پر ٹہلیں گے اور شاید ہوا میں جھولتی ہوئی ان چھ ساڑھیوں کو بھی دیکھ لیں گے جو مہالکشمی کے پل کی بائیں طرف لٹک رہی ہیں۔

یہ چھ ساڑھیاں جو بہت معمولی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں۔ایسی معمولی عورتیں جن سے ہمارے دیس کے چھوٹے چھوٹے گھر بنتے ہیں۔ جہاں ایک کونے میں چولہا سلگتا ہے،ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھا ہے۔اوپری طاقچے میں شیشہ ہے کنگھی ہے،سندور کی ڈبیا ہے،کھاٹ پر ننھا سو رہا ہے۔الگنی پر کپڑے سوکھ رہے ہیں۔یہ ان چھوٹے چھوٹے لاکھوں کروڑوں،گھروں کو بنانے والی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں جنہیں ہم ہندوستان کہتے ہیں۔

یہ عورتیں ہمارے پیارے پیارے بچوں کی مائیں ہیں، ہمارے بھولے بھائیوں کی عزیز بہنیں ہیں، ہماری معصوم محبتوں کا گیت ہیں، ہماری پانچ ہزار سالہ تہذیب کا سب سے اونچا نشان ہیں وزیراعظم صاحب! یہ ہوا میں جھولتی ساڑھیاں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔تم سے کچھ مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بہت بڑی چیز تم سے نہیں مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بڑا ملک، بڑا عہدہ اور بڑی موٹر کار، کوئی پرمٹ، کوئی ٹھیکہ، کوئی پراپرٹی، یہ ایسی کسی چیز کی طالب نہیں ہیں۔ یہ تو زندگی کی بہت چھوٹی چھوٹی چیزیں مانگتی ہیں۔

دیکھیے یہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے جو اپنے بچپن کی کھوئی ہوئی دھنک تم سے مانگتی ہے۔ یہ جیونا بائی کی ساڑھی ہے جو اپنی آنکھ کی روشنی اور اپنی بیٹی کی عزت مانگتی ہے۔ یہ ساوتری کی ساڑھی ہے جس کے گیت مر چکے ہیں اور جس کے پاس اپنے بچوں کے لیے اسکول کی فیس نہیں ہے۔ یہ لڑیا ہے جس کا خاوند بے کار ہے اور جس کے کمرے میں ایک طوطا ہے جو دو دن کا بھوکا ہے۔ایک نئی دلہن کی ساڑھی ہے جس کے خاوند کی زندگی چمڑے کے پٹے سے بھی کم قیمتی ہے۔ یہ بڈھی بھنگن کی لال ساڑھی ہے جو بندوق کی گولی کو ہل کے پھال میں تبدیل کر دینا چاہتی ہے تاکہ دھرتی سے انسان کا لہو پھول بن کر کھل اٹھے اور گندم کے سنہرے خوشے ہنس کر لہرانے لگے۔

لیکن وزیراعظم کی گاڑی نہیں رکی اور وہ ان چھ ساڑھیوں کو نہیں دیکھ سکے اور تقریر کرنے کے لیے چوپاٹی چلے گئے۔اس لیے اب میں آپ سے کہتا ہوں۔ اگر کبھی آپ کی گاڑی ادھر سے گزرے تو آپ ان چھ ساڑھیوں کو ضرور دیکھیے جو مہالکشمی کے پل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں اور پھر ان رنگا رنگ ریشمی ساڑھیوں کو بھی دیکھیے، جنہیں دھوبیوں نے اسی پل کے دائیں طرف سوکھنے کے لیے لٹکا رکھا ہے اور جو ان گھروں سے آئی ہیں جہاں اونچی اونچی چمنیوں والے کارخانوں کے مالک یا اونچی اونچی تنخواہ پانے والے رہتے ہیں۔

آپ اس پل کے دائیں بائیں دونوں طرف ضرور دیکھیے اور پھر اپنے آپ سے پوچھیے کہ آپ کس طرف جانا چاہتے ہیں۔ دیکھیے! میں آپ سے اشتراکی بننے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں آپ سے صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ مہالکشمی پل کے دائیں طرف ہیں یا بائیں طرف؟

12.4.2 افسانہ 'مہالکشمی کا پُل' تجزیہ

'مہالکشمی کا پل' ممبئی کی ایک چال میں رہنے والی، حالات کی ماری چھ عورتوں کی حسرت بھری زندگی کا افسانہ

ہے۔ان عورتوں کی زندگی کی کہانی الگ الگ ہے لیکن اس میں سے ہر کہانی سرمایہ دارانہ نظام میں محنت کشوں کے استحصال کی کہانی ہے۔شانتا بائی، جیونا بائی، لڑیا، منجولا، ساوتری اور مائی بھنگن سبھی مختلف علاقوں سے آئی عورتیں ہیں لیکن ان کا دکھ اور ان کا نصیب ایک ہے۔زندگی کی خوشیوں اور نعمتوں سے محرومی اور اس کا سبب ہے سرمایہ دارانہ نظام، جس نے لاکھوں لوگوں کی ضرورتوں اور آسائشوں کو چند سو لوگوں کی مٹھی میں بند کر رکھا ہے اور یہ مٹھی بہت کم اور بہت مشکل سے کھلتی ہے۔

کرشن چندر نے ممبئی کے ایک مقامی ریلوے اسٹیشن مہالکشمی پر بنے ہوئے پل پر لٹکی ہوئی ساڑھیوں کے حوالے سے ان کی پہننے والی عورتوں کی کہانیوں کو ایک افسانے کی ڈور میں پرو کر ہم تک پہنچایا ہے۔ان عورتوں میں سب سے پہلے شانتا بائی کا کردار ہمارے سامنے آتا ہے۔جو لوگوں کے گھروں میں برتن مانجنے کا کام کرتی ہے۔اس کے تین بچے ہیں۔ایک لڑکی اور دو لڑکے۔اس کا خاوند کپڑے کی مل میں کام کرتا ہے اور صبح سویرے گھر سے نکل کر شام کو واپس آتا ہے۔اس لیے شانتا بائی اس کا ٹفن تیار رکھنے کے لیے دوسرے دن کا کھانا رات کو ہی بنا لیتی ہے کیونکہ دن میں اسے بھی کام پر جانا ہوتا ہے۔وہ واپس آ کر نہاتی دھوتی ہے اور اپنی ساڑھی دھو کر پل پر سوکھنے کے لیے پھیلا دیتی ہے۔گھر میں وہ ایک پرانی غلیظ دھوتی پہن کر کام کرتی ہے۔'شانتا بائی کے گھر چولہا اسی وقت سلگ سکتا ہے جب دوسروں کے یہاں چولہے ٹھنڈے ہو جائیں۔'

شانتا بائی کی ساڑھی چھ سات ماہ سے زیادہ نہیں چلتی، وہ ہمیشہ بھورے رنگ کی ساڑھی خریدتی ہے کیونکہ یہ رنگ میلا بہت دیر میں ہوتا ہے۔لیکن کبھی اس نے شوخ رنگ بھی دیکھے تھے، جب وہ دھاراواڑ میں اپنے گاؤں میں رہتی تھی جہاں اس کے باپ کے دھان کے کھیت تھے اور ان کے آنگن میں امرود کا درخت تھا جس کی ڈال سے توڑ توڑ کر وہ امرود کھایا کرتی تھی۔اس وقت بادلوں میں شوخ رنگ کی دھنک اور میلوں میں شوخ رنگوں کی بہار اس نے دیکھی تھی۔مگر اب نہ تو امرودوں میں وہ مزہ رہا نہ رنگوں میں چمک دمک باقی رہی، بلکہ وہ سارے رنگ بھورے رنگ میں تبدیل ہو کر رہ گئے۔

جیونا بائی ایک بیوہ عورت ہے۔اس کا شوہر بھی کپڑہ مل میں کام کرتا تھا مگر اس کے پھیپھڑوں میں روئی کے مہین ریشے اس طرح سما گئے کہ اسے ٹی بی ہو گیا۔چنانچہ مل مالک نے اسے کام سے نکال دیا اور پینتیس سال تک کام کرنے کے باوجود اسے کوئی معاوضہ نہیں دیا۔'پینتیس سال پہلے ڈھوندو جیسے مل میں کام کرنے آیا تھا، اسی طرح خالی ہاتھ واپس لوٹا۔' اور پھر صحیح علاج نہیں ملنے کے نتیجے میں چل بسا۔

جیونا بائی بھی دوسروں کے گھروں میں جھوٹے برتن مانجنے کا کام کرتی تھی اور اکیلی رہتی تھی کیونکہ اس کی جوان بیٹی کسی بدمعاش کے ساتھ بھاگ گئی تھی جس نے اس کو فارس روڈ کے جسم فروشی کے ایک اڈے پر پہنچا دیا تھا۔ڈھونڈو کی ارتھی اٹھنے کے وقت ایک بھاری بدن کی عورت چمکیلا لباس پہن کر آتی ہے اور جیونا بائی سے لپٹ کر

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔۔۔۔۔ بیٹی کو اس طرح واپس آتا دیکھ کر جیونا بائی نے خود کو بہت بے عزت اور بے بس محسوس کیا۔ اس نے دھکا دے کر بیٹی کو الگ کیا اور چیخیں مار کر رونے لگی۔ جیسے اب سب کچھ مر گیا ہو۔ اس کا پتی، اس کی بیٹی، اس کی عزت جیسے اس کے پاس اب کچھ بھی نہیں تھا۔

تیسری ساڑھی ساوتری کی ہے جو اس کہانی کے راوی کی بیوی ہے۔ کرشن چندر نے ان مزدوروں اور محنت کشوں کے درمیان ایک دسویں پاس کلرک کا کردار بھی تخلیق کیا ہے اور اس کی زبانی دوسرے کرداروں کی زندگی کو بیان کیا ہے۔ اس کلرک کو بھی اتنی ہی تنخواہ ملتی ہے جتنی مل مزدوروں کو ملتی ہے اس لیے وہ بھی آٹھ نمبر کی چال کے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا ہے جسے ممبئی میں کھولی کہا جاتا ہے۔ اس کے آٹھ بچے ہیں جن کے کھانے، کپڑے کا خرچ ہی راوی کی برداشت سے باہر ہے۔ لہذا ان کی تعلیم کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔

ساوتری جب بیاہ کر کے ممبئی آئی تھی تب اچھی اچھی باتیں سوچا کرتی تھی اور مسکراتی رہتی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ مسکراہٹ غائب ہوگئی اور اس کی جگہ ماتھے کی شکن نے لے لی۔ اب وہ اپنے شوہر کو بھی کاٹ کھانے دوڑتی ہے اور بات بات پر بچوں کو بے تحاشہ پیٹنے لگتی ہے۔

چوتھی ساڑھی جھبو بھیا کی بیوی لڑیا کی ہے۔ جھبو بھیا نے اسے ایک بدمعاش سے سورپے میں خریدا تھا۔ جھبو بھیا مل مزدور تھا لیکن ایک دن مل مینیجر سے مار پیٹ کرنے کے نتیجے میں چند غنڈوں کے ذریعے اس کی بری طرح پٹائی کی گئی اور نوکری سے نکال دیا گیا۔ لڑیا نے اس دن سے اپنے سر پر سبزی کا ٹوکرا اٹھا کر گلی گلی سبزی ترکاری بیچنے کا دھندا شروع کر دیا۔ اس کا کوئی بچہ نہیں ہے اس لیے اس نے ایک طوطا پال رکھا ہے۔

پانچویں ساڑھی منجولا کی ہے جو ایک جوان بیوہ ہے۔ اس کا شوہر مل میں چرخی کی لپیٹ میں آ کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ منجولا نے ہرجانے کی درخواست دی تو وہ نامنظور ہوگئی۔

چھٹی ساڑھی کا رنگ لال ہے اور اس کی پہننے والی مائی جوسیتو کی ماں تھی، مر چکی ہے۔ رسم کے مطابق اس ساڑھی کو چتا کے ساتھ جل جانا چاہیے تھا مگر اب اسے اس کی بہو پہنتی ہے کیونکہ 'مردوں کی عزت اور احترام سے کہیں زیادہ ضروری ہے کہ زندوں کا تن ڈھکا جائے۔'

سیتو اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے مہنگائی کے خلاف جلوس نکالا تھا جس پر پولس نے گولی چلائی جوسیتو کی ماں کو لگی اور وہ اس دنیا سے چل بسی۔ جبکہ ہڑتال اور جلوس سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ سیتو کو جیل میں ڈال دیا گیا اور اس کی بیوی اکیلی رہ گئی۔

'مہالکشمی کا پل' میں کرشن چندر ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آ کر ممبئی میں جیسے تیسے دن کاٹنے والے محنت کشوں، خصوصاً ان کی عورتوں کے معاشی اور نفسیاتی مسائل کی عکاسی کی ہے۔ انہوں نے سوتی ساڑھیوں کے

حوالے سے اس بدنما حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ جن ملوں میں اعلیٰ درجے کا کپڑا تیار ہوتا ہے اور سرمایہ داروں اور دولتمندوں کے جسموں کی زینت بنتا ہے ان ملوں میں کام کرنے والی عورتوں کو تن ڈھکنے کے لیے ڈھنگ کی ساڑھی بھی میسر نہیں ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام پر کی گئی فنکارانہ تنقید ہے جس کی تہہ میں اشتراکی نظریہ صاف جھلکتا ہے۔

اس افسانے میں نچلے متوسط طبقے کا ایک پڑھا لکھا فرد (کلرک) بھی ہے جو معاشی اعتبار سے مزدور طبقے میں شامل ہے اور سب سے نچلی سطح پر رہنے والی سیتو کی بیوی بھی شامل ہے جو چال سے باہر رہنے پر مجبور ہے کیونکہ اسے ایک کھولی بھی میسر نہیں آسکتی۔

اس افسانے میں سیاستدانوں پر بھی طنز کیا گیا ہے جو لوگوں کی معاشی حالت سدھارنے اور انہیں مستقبل کے سپنے دکھانے کی باتیں تو کرتے ہیں لیکن عملاً سرمایہ داری کی حمایت کرتے ہیں۔

کارل مارکس نے کہا تھا کہ دنیا میں دو ہی بڑے طبقے ہیں۔ ایک استحصال کرنے والوں کا اور دوسرا استحصال کا شکار ہونے والوں کا۔ کرشن چندر نے مہالکشمی کا پل میں پل کی جانب لٹکی ساڑھیوں اور ان کو پہننے والیوں کے بارے میں بتانے کے بعد پل کی دائیں طرف لٹکی رنگارنگ ساڑھیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو مل مالکوں اور اونچی اونچی تنخواہ پانے والوں کی ہیں اور جنہیں دھوبیوں نے دھو کر انہیں سوکھنے کے لیے وہاں پھیلا دیا ہے۔ آخر میں کرشن چندر ہم سے سوال کرتے ہیں کہ ہم کس طرف ہیں پل کی بائیں طرف یا دائیں طرف یعنی ہم پسے ہوئے لوگوں کے ساتھ ہیں یا انہیں پیسنے والوں کے ساتھ؟ یہاں پہنچ کر کرشن چندر اشتراکیت کا نعرہ لگانے لگے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کا یہ افسانہ فنی اعتبار سے کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود اردو افسانے کی تاریخ میں افسانہ 'مہالکشمی کا پل' کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔

12.5 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ

- کرشن چندر کی شخصیت اور فن سے متعارف ہوئے
- افسانہ 'مہالکشمی کا پُل' کی فنی خصوصیات سے واقف ہوئے
- افسانہ 'مہالکشمی کا پُل' کے موضوع سے متعارف ہوئے
- افسانہ 'مہالکشمی کا پُل' کی قدر و قیمت سے واقف ہوئے

12.6 اپنا امتحان خود لیجیے

1- کرشن چندر کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

2- کرشن چندر کے پانچ افسانوی مجموعوں کے نام لکھئے۔

3- مہالکشمی کا پل کہاں واقع ہے؟

4- اس افسانے میں کرشن چندر نے کتنی ساڑھیوں کا ذکر کیا ہے؟

12.7 سوالات کے جوابات

1- کرشن چندر کی پیدائش 23 نومبر 1914 کو بھرت پور راجستھان میں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ لاہور چلے گئے۔ 1940 میں لاہور سے دہلی آئے اور آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد بمبئی چلے گئے اور فلموں کے لیے کہانیاں، مکالمے اور مناظر لکھنے لگے۔ ایک ادیب کے طور پر کرشن چندر کو اپنی زندگی میں ہی بہت شہرت اور مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ مختلف اداروں انھیں انعامات اور اعزازات سے نوازا۔ 1969 میں حکومت ہند نے انھیں پدم بھوشن کا اعزاز عطا کیا۔ ان کا پہلا افسانہ ''یرقان'' 1938 میں ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوا۔ ان کی زندگی میں ان کے افسانوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے جن میں ''طلسم خیال، نظارے، زندگی کے موڑ پر، نغمے کی موت، پُرانے خدا، ہم وحشی ہیں، ان داتا، تین غنڈے، اجنتا سے آگے، یوکلپٹس کی ڈالی'' وغیرہ کافی مشہور ہوئے۔

ابتدا میں کرشن چندر کی افسانہ نگاری رومانی تحریک سے متاثر تھی اور ان کے افسانوں میں مناظر فطرت اور حسن و جمال کے عناصر حاوی تھے۔ بعد کے افسانے بھی رومانی فضا سے یکسر پاک نہیں ہیں البتہ ان میں زندگی کی بوقلمونی اور حقیقت کچھ واضح ضرور ہو گئی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ کرشن چندر کے افسانے رومان سے حقیقت کی طرف آئے اسی لیے ان کے افسانوں میں حقیقت اور رومان کا ایک خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے۔

2- (i) طلسم خیال

(ii) زندگی کے موڑ پر

(iii) نغمے کی موت

(iv) ہم وحشی ہیں

(v) ان داتا

3- مہالکشمی کا پل ممبئی میں واقع ہے۔

4- کرشن چندر نے اس افسانے میں چھ ساڑھیوں کا ذکر کیا ہے۔

12.8 فرہنگ

لفظ	معنی
متاثر	اثر قبول کرنے والا
ذکر	تذکرہ
واقع	پیش آنے والا
امتزاج	ملاوٹ، ہم آہنگی
مناظر	نظارے
بوقلمونی	رنگارنگی
وحشی	غیر مہذب

12.9 کتب برائے مطالعہ

1 مرتبہ۔ڈاکٹر اطہر پرویز کرشن چندر ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1986

2 سید احتشام حسین اردو ادب کی تنقیدی تاریخ این سی پی یو ایل، نئی دہلی 2007

3 گوپی چند نارنگ اردو افسانہ: روایت اور مسائل ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 2000

NOTE

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY